ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.4 (2023)
(October- December)

"Image of Women in Manto's Fiction"

منٹو کا تصور عورت "وجودی نہیں حسی"

ڈاکٹر عمران ازفر
شعبہ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا

Abstract

Manto (1912-1955) was a well-known Urdu short story writer. whose life story became a subject of intense discussion and introspection,just because of his writings from he describes his society and Cultural civilization in real active formation. During his life of the last two decades, many attempts were done to break his character and also negates his fiction so it describes the conflict of socio-political and religious cultural realities of the post-partition era in Pakistan and Urdu litreture.His final works, which grew from the social climate of Urdu world but he always seeks for humanity via his creative work.His story reflected an intense conditions of human rights towards darkness and contained satire that verged on dark comedy, Which seen in his final work, Toba Tek Singh.Urdu critics form him as sexual orienter and try to thrown his works in yellow litreture. But the truth is something else. In this article we discussed the influence and thinking discourse of his own story, but also that of the collective madness that he saw in the ensuing decade of his life and present in short story with its all conditions of reality. Article based upon qualitative research method,So conclusions can made by the marks of picked prominent critic's of manto's fictional work r they make some false descriptions of this great artists work's.

Key Words: - Short story, sexual characteristics, Urdu critic's, Realism, Method, verged, Dark side of society, Socio-political.

کلیدی الفاظ: افسانہ اور جنسیات، منٹو شناسی، جنسیت، قرب متن مطالعات، تخلیقی ضمیر، دہشت پسند۔

اردو افسانے کی نئی موضوعی و فکری روایت کو "انگارے" کی اشاعت سے موسوم کیا جائے تو فی زمانہ نئے اردو افسانے کے بل و پر صدی بھر کی مسافت پر کئی طرح کے رنگوں، خوشبوؤں اور سیاسی سماجی تعاملات سے معمور ہیں۔ اردو افسانے کے مختلف نمائندہ تخلیق کاروں نے انسان کے فرد اور داخلی جذبات کو افسانے کی فضا میں سمو کر پاکستانی معاشرے کے خال و خد کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ افسانے کی بدلتی دنیا کا پہلا مرکزی پڑاو ترقی پسند تحریک کا زمانہ ہے۔ اس عہد میں پریم چند کے افسانوں کے بعد کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور سمیت افسانہ نگاروں کی ایک بڑی کھیپ نے اردو افسانے کے رخ و کاکل سلجھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس روایت کے دو بنیاد گزار سعادت حسن منٹو اور غلام عباس اپنی موضوعی جزئیات اور معنوی جہاں میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ سعادت حسن منٹو اپنے افسانے کے توسط سے اپنے کرداروں کی ظاہری شخصیت کی خرابی کو نظر انداز کرتے ہوئے داخلی شعور و ادراک میں موجود معصوم روح کو پیش کرتا ہے جبکہ غلام عباس سے دوسری حد پر کھڑا ہو کر بظاہر خوش شکل خوش لباس کرداروں کی داخلی الجھنوں کا پیش کار ہے۔ منٹو کا موزیل اور باسط جبکہ غلام عباس کا اوور کوٹ اور فینی ہیر سیلوں ذہن میں رکھیں تو مندرجہ بالا سطور کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.4 (2023)
(October- December)

اردو کے نئے افسانے کا ایک بڑا موضوع عورت رہی ہے۔ پریم چند کے "کفن" سے احمد ندیم قاسمی کے "گھر سے گھر تک"، سعادت حسن منٹو کے "کالی شلوار" سے راجندر سنگھ بیدی کے "گرم کوٹ" تک، رشید امجد کے "گلاب کا پھول" سے محمد منشایاد کے "نظر کا دھوکا" تک میں ہر کہانی کے مرکزی فیبرک میں عورت کی ظاہری یا پوشیدہ حسیات کی بنیاد پر سماجی تفاعل کی تفہیم اور پدر شاہی معاشرے میں عورت کی حیثیت کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ بھی اپنی سطح پر ایک حقیقت ہے کہ مختلف افسانہ نویسوں نے عورت کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو افسانے کی کائنات میں سمویا ہے۔ ان میں سعادت حسن منٹو کو جنس نگار افسانہ نویس کے طور پر شہرت ملی جبکہ منٹو کی پیش کردہ عورت کے سیاسی سماجی تعامل میں جنسیت سوائے وجود کے تحفظ اور معاشی وسائل کے حصول کا ایک ذریعہ ہے جبکہ خوشونت سنگھ کی "سیاہ یاسمین"، رحمان مذنب کی "خوشبودار عورتیں" پاکستانی معاشرے میں موجود عورت کے جنسی ہیجانات کی نمائندہ متون ہیں۔ ہمارے اس مقالے میں منٹو کے افسانوی متن میں عورت کے تمثال کی داخلی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مفروضے کی تسوید سعادت حسن منٹو پر کی گئی پون صدی کی تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے ساتھ، ان متون کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جن کی بنیاد پر منٹو کو جنس پرست، فحش نگار افسانہ نگار کہا جاتا ہے اور جن امور سے جزوی یا کلی طور پر اجنبی لوگوں کے گروہوں نے مذہبی گروہوں کے ایقان کو بروئے کار لاتے ہوئے سعدت حسن منٹو کو فحش نگار افسانہ نگار کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ تاثر اب تک راسخ ہو گیا کہ منٹو کے حلیف یا حامی ناقدین نے بھی معذرت خواہانہ انداز پر منٹو کے متن کی تفہیم کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے کی سب سے بڑی مثال "منٹو نوری نہ ناری" کی مصنفہ "ممتاز شیریں" ہیں۔ جو عورت ہونے کے باوجود منٹو کے متون میں موجود منٹو کے حسی تمثال اور اس کی فاعلی تصاویر کو نگاہ کیں رکھنے کی بجائے، ان نکات کی وضاحت پر اپنی توانائی صرف کرتی ہیں جو خاص پس منظر کے تحت منٹو کے افسانوں کی تفہیم میں روا رکھی جا رہی تھیں۔ در حقیقت سعادت حسن منٹو بعد از قیام پاکستان جماعت اسلامی اور قدامت پرستوں کا آسان ہدف رہے۔ اردو کے دوسرے افسانہ نگاروں میں رحمان مذنب نے طوائف کے کردار، اس کی جنسی خواہشات اور ان خواہشات کی تکمیل میں کوٹھے کے کردار کو سیاسی، سماجی اور معاشرتی حوالوں سے پیش کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ رحمان مذنب کا افسانہ اپنی مجموعی فضا اور کرداری نفسیات میں عورت کے جسم، اس کے اتار چڑھاؤ اور جنسی نفسیات کا نمائندہ متن ضرور ہے مگر تخلیقی پہلو پر اس کا تقابل منٹو کے متون سے کرنا علمی دیانت نہیں۔ ہمارا مقالہ لگ بھگ سو برس پر مشتمل افسانے کی روایت کے بتدریج تجزیاتی مطالعات کا پہلا پڑاو ہے جس میں سعادت حسن منٹو کے متون کا تجزیاتی ڈسکورس پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسرے مرحلے پر دیگر نمائندہ افسانہ نگاروں جیسے راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، اعظم کریوی، عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، صغیر ملال، محمد خالد اختر، واجدہ تبسم، شمشاد احمد، محمد حامد سراج، اسلیم سراج الدین، انوار احمد، رشید امجد، منشایاد، احمد جاوید، طاہرہ اقبال، لیقت علی، آدم شیر سمیت دیگر نمائندہ افسانہ نگاروں کے قرب متنی مطالعات سے معنی کی یافت کی کوشش کے ساتھ ان افسانہ نویسوں کو سیاسی سماجی تناظر کی بنیاد پر باہمی تقابل کے عمل سے گذارنے کے ساتھ، ان پر موجود تنقیدی متون کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا جائے گا۔ مقالہ ہذا میں سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں موجود عورت کے کردار کی جسمانی اور احساساتی سطحوں کا مطالعاتی ڈسکورس منٹو کے افسانوں کے قرب متنی مطالعات کے ساتھ، منٹو پر مصنفہ تنقیدی متون کے تجزیاتی مطالعات پر اساس ہے۔

حقیقت نگار علامہ نیاز فتحپوری نے عورت اور فنون لطیفہ کے باب میں عورت کے مزاج میں پائی جانے والی فطری ذہانت، تخلیقی صلاحیتوں اور اپنی ذات پر بھروسے کے حوالے سے لکھا کہ "عورتوں کی ذہانت و فراست، محنت و جفاکشی کی مثال میں وہ چرمی خیمے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جو مسطح حصص ملک میں نصب کرنے کے لئے وہاں کی عورتیں تیار کرتی ہیں یہ خیمے بھینس کی کھالوں سے مخروطی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ کھالوں کو صاف کرتی ہیں۔۔۔ اس کے بعد متعدد کھالیں لے کر ان کو کاٹتی ہیں اور پھر سب کو سی کر چھتری کی شکل میں تیار کرتی ہیں۔ ایک جانب کھلا رکھا جاتا ہے جو خیمہ نصب کرنے کے بعد صرف فیتوں کے ذریعے سے کس دیا جاتا ہے اور نیچے کا تھوڑا سا حصہ آنے جانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے "(1) تاریخی تناظر عورت اور مرد کے باہمی روابط کو ہمیشہ سے متوازی پیش کرتا ہے اور ان کی سماجی فعالیت کا گواہ ہے مگر وقت کی دھار نے ایک ایسا رخ بدلا کہ عورت اور مرد کے درمیان محض گاہک اور دکاندار Product & Consumer کا رشتہ رہ گیا جو عورت کی انفرادی شناخت کا دشمن اور معاشرے میں اس کے مثبت کردار ادا کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوا۔ تخلیقی جمالیات کا بنیادی وظیفہ اپنے ادراکی، تجربی، ارادی اور حواسی محرکات کی نہاد پر انسانی تجربے اور احساس کو شدید گہرائی تک متاثر کرنا ہے۔ اپنی بنیاد میں یہ تعاملات فرداً فرداً یا پھر باہمی ارتباط کی کسی خاص صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی اجتماعی حالت میں ہیگل کے نظریہ جمال کے عکاس دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں جوہر شئے کے وجود میں شامل ہے بجائے باہر یا خارج کے۔ جب کہ وجودیت کے پش کار جوہر پر خود وجود کو مقدم قرار دیتے ہیں کہ ان کے مطابق اپنے عصر سے پیکار تفاعل میں وجود کی حصہ داری اولین جبکہ جوہر کی تخصیص بعد از وجود ہوتی ہے۔ افسانے میں سعادت حسن منٹو نے عورت اور اس کے جوہر کو یوں ہم

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.4 (2023)
(October- December)

آمیز کر کے پیش کیا ہے کہ ان کے کسی ایک رخ کو الگ کر دیا جائے تو پورا چہرہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ منٹو کے ہاں عورت کا وجود اور جوہر (داخلی احساس) اپنی حقیقی طاقت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔

ادبی متون میں یہ جوہر وہ بنیادی مرکب ہے۔ جو ایک طرف معاشرے کی انفعالی صورت سے جنم لینے والے اسرار کا پیش کار ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف حال میں موجود رہ کر مستقبل کی پیش بندی کرتا ہے۔ تخلیقی/ادبی جمالیات کا کام ایک طرف انسان کے انفرادی نظامِ محسوسات پر اثر پذیر ہونا ہے۔ تو دوسری طرف قوم کے مجموعی مزاج اور طرزِ احساس کی شناخت میں معاونت بھی فراہم کرنا ہے۔ جمالیات سے وابستگی کی کسی صورت کے بدلے شاعر شعر کہتا ہے، تو فکشن کار فکشن لکھنے کی ترغیب پاتا ہے۔ کیوں کہ ان کے جمالیاتی احساس، عوامل و حوادث سے روبرو ہونے کا الگ الگ انداز، اشیاء اور مظاہر کو عمومی صورت کی بجائے، تخصیصی انداز فکر فراہم کرتے ہیں۔ یوں گویا جمالیات کے زیر اثر تخلیق، ایک فرد کی طرف سے، اس کی رغبت یا توجہ کے بارے رد عمل کی ایک عملی پیشکش ہے۔ جس کو وہ احساس کے انفراد سے اجتماع کے اسرار و رموز کے تفہیمی نظام کے سامنے رکھ چھوڑتا ہے۔ جس کے ساتھ سماجی اجزاء اپنی اپنی ترکیب اور ذوق کے سبب سے تعلق استوار کرتے ہیں۔ یوں جمالیات اپنی بنت میں پیچیدہ اور تہہ دار ہوتی ہے۔ انسانی نفسیات میں فطری طور پر حساسیت اور پیچیدگی پائی جاتی ہے (جس کا تقابل کسی مصنوعی دانش سے ممکن نہیں) اس احساس و ادراک کی متفرق لہروں کے ہر شخص پر مختلف سطح اور الگ طرح سے اثرات ہوتے ہیں۔ جن کی دلیل پر وہ ان کی اپنے ذوق سے ہم آہنگ تشریح کرتا ہے۔ جمالیاتی اثرات کے تحت تخلیق کردہ ادب کی تشریح و تعبیر کے معاملے میں ناقد کے پاس کئی طرح کے پیچیدہ اسرار کی وسعت اور انفرادی تشخص کی تنگ زمین ہوتی ہے۔ جس کے تحت وہ کسی بھی ادب پارے کی تشریح و تعبیر کے علاوہ اس کے سماجی تفاعل کا تعین کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جمالیاتی متون کی تشریح و توضیح کے باب میں بعض ناقد ابہام ایسے سقم میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس تجربے، مشاہدے، احساس یا پھر لغت سے واقفیت کا وہ معیار موجود نہیں ہوتا جو مخصوص فن پارے کی داخلی پیچیدگی کے در باز کرنے کے لیے بہتر سے بہتر انداز پر تفہیم و تشریح میں معاون ہو سکے۔ نظم و غزل کے تفہیمی امکانات میں ایسے مسائل کا در آنا معمول کا عمل ہے۔ مگر بعض دفعہ فکشن کی تفہیم میں بھی یہ پہلو دیکھنے میں آتے ہیں کہ متن کی مجموعی معنیات اور ناقدین کی تشکیل کردہ مجموعی فضاء کے درمیان ایک خاص طرح کا فاصلہ پایا جاتا ہے۔ جو معنی کے قیام میں غلط روش اختیار کرتا ہے۔ اردو ادب میں اس کی سادہ سی وجہ تو ناقدین کی بڑی تعداد کا الاتِ تفہیم سے ناواقفیت، تجربے، مشاہدے، مطالعہ کی کمی بھی ہے اور اس پر مزید اہم وجہ اردو میں ابھی تک کسی ادبی تاریخ کا موجود نہ ہونا ہے۔ اردو میں اکیسویں صدی کی تیسری دہائی کی پہلی چوتھائی مکمل ہونے تک کوئی بھی ادبی تاریخ نہیں لکھی گئی اور نہ ہی متفرق ادبی اصناف کی تفہیم و تشریح کے بارے قابل بھروسہ اصول وضع کیے گئے ہیں بلکہ ادب خواہ وہ منظوم ہو یا منثور، کا تجزیہ تخلیق کے زمانے کے درباری اور جنگی حالات کے تناظر میں کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے کسی بھی ادب پارے کے داخلی اور خارجی، صوتی اور ساختی، معنوی اور ثقافتی و تہذیبی ارتباط کے احساس کو کھوجنا مشکل امر بنتا چلا جا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تخلیقی متون کی بازیافت میں رائج کج آرائیوں کے عجیب و غریب واقعات معمول کا حصہ بن چکے ہیں۔

تفہیم و تنقید کے اسی بے سر و پا نظام کے ساتھ وابستہ اردو کا ناقد میراجی کے نظمیہ متن کو سمجھنے کے لیے نظم کے تخلیقی باطن، ہیتی اور تکنیکی پیشکش اور اس متن کے مجموعی ساختے میں پنہاں مخفی اسرار سے تعلق استوار کرنے کی بجائے، میراجی کی بظاہر بوسیدہ، ملگجی پینٹ کی پھٹی جیبیں ٹٹولنے لگتا ہے۔ وہی جیبیں جس کا ادراک اس نے شاعر کے متن سے نہیں بلکہ منٹو کے "تین گولوں" سے حاصل کیا ہے۔ جس پر وہ میراجی کے لباس کی بوسیدگی اور ظاہر کی پراگندہ شخصی صورت حال کے تنجن کے ملاپ سے ایک نیا تنقیدی شیرازہ تیار کر کے اسی بوسیدہ رسی کو میراجی کی نظم کا مجموعی ساختہ قرار دے دیتا ہے، یونہی یہ ناقد عصمت چغتائی کے احساسِ جمالیات سے آگہی کے لیے اس کے لرزتے ہوئے لحاف میں پوشیدہ ہم جنسی کے امکان کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں کہ عصمت کی آزادہ روی کو مذہب سے دوری کا جواز بنا کر اس کے متن کے جمالیاتی، متنی پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کشور کے متن پر بات کرنے سے پہلے اردو کا ناقد تہیہ کر لیتا ہے کہ اس نے کشور ناہید کو مشرقی عورت کے حقوق کی پاسبان ثابت کرنا ہے۔ تو اقبال کے اسلامی اصول پر خاندانی حجام کی طرف سے دستِ ہنر کے اظہار سے حاصل شرعی داڑھی اور علی اعلان شہادت کی خواہش کے سوا کسی بھی طرح کی معنوی پیش کاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ یوں اردو کے مذہبی ناقدین جمالیات اور حسنِ جمالیات سے عاری شعور کے تحت ادب کے آسمان سے ایک منفرد شاعر، نہایت زرخیز متخیلہ اور تاریخی شعور سے بھرپور شاعری کو غائب کر کے ملت اسلامیہ کو ایک "حکیم الامت" فراہم کرتے ہیں جیسے اس سے پہلے میر ایسے نازک مزاج عورت پسند جنسی لوازمات کے دلدادہ شاعر کو قنوطی، موت پسند بنا کر پیش کیا کہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے یہی منطقی نتائج نکالنا ضروری تھے۔ یہی ہر فن مولا ناقدین پروین شاکر کے کلام میں کسمساتی، اپنے جذبوں کی حدت سے پیکار نازک اندام لڑکی کی معاشرتی جدل میں حصہ داری کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے برعکس مشاعروں میں ظاہر شاعرہ کے رومانی موضوعات کی مجلسی تکرار تک محدود منظر نامے کو زیر

بحث لاتے ہیں۔ بصورت دیگر قرار داد مقاصد کی نہاد پر قائم ریاست کے ستون عورت کے احساس کی واضح نمائندگی سے لرزہ براندام ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناقد مولوی عبدالحق/مولانا مودودی جیسے بڑے ناموں کی طرف سے "سیکولر" کا متبادل "ملحد" پورے ایمانی جذبے کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ یہ ان کی ریاستی پالیسی کے عین مطابق ہے۔اردو کے اس تربیت یافتہ ناقد کے ہاں منشی پریم چند، کرشن چندر، غلام عباس، راجندر سنگھ بیدی، اسلم سراج الدین، منشاء یاد، رشید امجد، ڈاکٹر انوار احمد، لیاقت علی سمیت مختلف تخلیق کاروں کے تخلیقی متون کے معنی کی کشید کے لیے ایک طرح کے "نیک اطوار" طے شدہ اصول پہلے سے موجود ہوتے ہیں یوں اردو کی عمومی تنقید اپنی اساس میں طاقت کی غلام گردشوں کے پیاسوں اور لفظ کی حرمت کے شیدائی کے درمیان تمیز کی قوت سے بے بہرہ ہوتی جارہی ہے۔ جس پر مزید تڑکا مغربی مصنفین کی کتب کے بے سروپا تراجم سے لگایا جارہاہے۔ جن کی نصابی ضرورت کے تحت بڑھتی مانگ سے تخلیقی متون کی حیثیت روز بروز کمتر ہوتی جارہی ہے۔ان سب عوامل کے مجموعی اثرات سے آج کا اردو ادب تخلیقی کم اور صارفی بنیادی اصولوں پر زیادہ استوار ہے۔ یہاں تک کہ روایت پر تفصیلی رسالے مرتب کرتے ہوئے نام نہاد ادب پرست مدیر و مرتب چند ہزار روپے کے عوض نظم کی سو سالہ روایت سے فیض احمد فیض کو بے دخل کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ تو قدامت پرستوں کو منٹو کے متن میں اپنے داخلی احساس کی گھمبیر تا سے جھگڑتی طوائف جنس کا اشتہار دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ یہ محل اس موضوع پر تفصیلی مبحث کا نہیں تو ان تفاصیل سے گریز اختیار کرتے ہوئے براہ راست اپنے حقیقی موضوع کی طرف آتے ہیں۔

ہمارے مقالہ کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ سعادت حسن منٹو کے متن کی تفہیم کی غالب روایت نہایت عامیانہ یعنی جنسی تلذذ کی بنیادوں پر قائم ہو چکی ہے۔ ناقدین منٹو کو عورت حتیٰ کہ طوائف عورت کے ہمدرد مصنف کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ گو یہ نتیجہ بالکل ہوا میں تعمیر نہیں کہ اس کی دلیل ٹھنڈا گوشت، موذیل، دھواں، بلاوز، بُو وغیرہ ایسے چند آٹے میں نمک برابر متون ہیں۔ جو فی الحقیقت منٹو کے چند فیصدی مواد کا احاطہ کرتے ہیں۔ مگر ان میں بھی منٹو جنس پرست نہیں بلکہ جنس زدہ معاشرے کے مزاج کو تصویر کر رہا ہے۔اس کے برعکس ہندوستان میں جاری سیاسی تفاعل اور معاشی اونچ نیچ کے پیچیدہ اسرار کو موضوع بناتے ہوئے سعادت حسن منٹو آج سے سو برس پہلے کے انگلستان اور امریکہ کی سیاسی معاشی صورتِ حال پر گرفت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تماشا، نیا قانون، نعرہ، باسط، ممد بھائی، بابو گوپی ناتھ، یزید، دیوانہ شاعر، کالی شلوار، انقلاب پسند، چوری منظور، طاقت کا امتحان، لالٹین، ایک خط، ٹیڑھی لکیر، بانجھ، گورمکھ سنگھ کی وصیت، خالی بوتلیں خالی ڈبے، شہید ساز، نمرود کی خدائی، ساڑھے تین آنے، سراج، سودا بیچنے والی، پھاتو، جان محمد، شانتی، لائسنس، اس کا پتی سمیت کس قدر اہم افسانے، اس ریاکاری اور منافقت سے بے بہرہ تخلیق کار کے ہاں موجود ہیں۔ جو ہندوستان کی مقامی تہذیبی اکائیوں کے متفرق اجزا پر رائے کے علاوہ عالمی منظر نامے اور اس منظر نامے میں ہندوستانی معیشت و سیاست کی حصہ داری پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

ان افسانوی متون میں روائیتی عاشق ہیں، منہ زور اور گھر کی چار دیواری پھلانگ کر عشق کی تکمیل میں مصروف عورتیں ہیں، وفادار بیوی اور بے وفا شوہر تو سادہ لوح مرد اور گنجلک طبع عاشق مزاج بیویاں ہیں۔ان افسانوں میں منظور جیسے صاف دل بچے ہیں۔ تو ممد بھائی جیسے معصوم دل عمر رسیدہ عاشق۔ مگر ان میں لکھنؤ کے بالا خانے کی طوائف نہیں ہے اور نہ ہی پریم چند کی طرح جاگیر دار کے ہاتھوں پامال ہونے والے مادھو اور گھیسو کے روز و شب کے فسانے کی بے رحم حقیقت نگاری ہے (گو کہ ریاکاری کو چاک کرتے ہوئے منٹو کے اندر بھی مبلغ جاگتا ہے، کہ اس نوعیت کی فکریات کے ساتھ اس مبلغ کا تعلق لازمی ہے) منٹو شناسی کی عمومی روایت میں ہمارے ناقد اور اردو ادب کے طالب علم کی تان منٹو کی جنسیت پر ٹوٹتی ہے۔ وزیر آغا کے مطابق جدید بین الاقوامی حالات کے تغیر سے سماجی زندگی میں آنے والی تبدیلی کے باعث منٹو عورت کے موضوع کو چُنتا ہے یعنی زمانہ قدیم سے عورت بے کس اور زندگی کے مرکزی دھارے سے الگ رہی ہے؟ اس مضمون سے میں وزیر آغا کے خیال میں "منٹو کے بیش تر افسانوں کا موضوع عورت ہے۔ بیشتر اس لیے کہ اس کے ہاں "نیا قانون" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایسے افسانے بھی ملتے ہیں۔ جن کا موضوع مختلف اور تناظر زیادہ وسیع ہے مگر ان افسانوں میں بھی جن میں عورت کو موضوع بنایا گیا ہے اول درجے کی تخلیقات صرف چند ایک ہیں"(2)۔ کوئی بھی متوازن ذہن ان تین سطور کے مطالعہ سے ناقد کی فکریات میں موجود تعصب اور تخلیق کار کے ساتھ فکری لاتعلقی بلکہ تضاد کی رمز کو پا سکتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور اس قبیل کے دوسرے ناقدین نے منٹو کے لامحدود سیاسی سماجی کینوس کو جنس اور عورت تک محدود کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک لاجواب کہانی کار چھوٹے سے خول میں بند ہو کر مستقبل کے امکانات سے دور ہو جاتا ہے کیونکہ ڈاکٹر وزیر آغا سمیت کئی دوسرے ناقد مصنف، سماج اور ادب کی مثلث کے انکاری ہیں اور اس انکار کے بعد وہ منٹو کے متون کی کم از کم تحسین نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے اپنی تصنیف "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ" میں منٹو کے باب میں اپنے تجزیاتی ڈسکورس سے منٹو کے متن میں پیش کردہ مختلف پہلوؤں کا نہایت خوبی سے تجزیہ کیا ہے۔ جس میں ممتاز شیریں کا سا وضاحتی اور بین اسطور دفاعی لہجہ نہیں بلکہ واضح طور پر اپنی فکر کے ساتھ اخلاص اور متن کی شرح پر کامل یقین دکھائی دیتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انوار صاحب مزید تفصیل سے جنسیت اور زندگی کے درمیان کھچی فصیل کے امتیازات کو واضح اور نمایاں کر سکتے تھے۔ یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ منٹو ہندوستان کا تخلیقی ضمیر (3) کیسے ہو سکتا ہے کہ منٹو کے پیرو کار یا اس کے فن کی عظمت کو ماننے

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.4 (2023)
(October- December)

والے بھی اسے "رحم دل دہشت پسند"(4) کہتے ہیں۔ تو گویا ہندوستان کا تخلیقی ضمیر رحم دل بھی ہو تو دہشت پسند ہوتا ہے؟ جس معاشرے میں انسان کے احساس کو تخلیقی پیرائے میں پیش کرنے والے افسانہ نویس کو دہشت پسند قرار دیا جاتا ہو۔ تو اندازہ لگائیں کہ اس معاشرے میں انسانی اخلاقیات کس ڈگر پر استوار ہوں گی یا نسیم حجازی کے فکشن اور ضیاء الحق، اشفاق احمد کی تبلیغ و تزکیہ نفس نے سماجی تفاعل میں کیا شکل اختیار کر لی ہو گی۔ جس منٹو کو "ابو سعید" دہشت پسند کے عنوان سے نواز رہے ہیں وہ دل کا نہایت معصوم ہے اور اس کی بے چین روح جنس ایسی شئے کے تصور سے ہی ناآشنا ہے۔ منٹو عمر بھر معاشرے کے جس ریاکارانہ چہرے، مذہبی خول میں چھپی رزیل روحوں سے برسرپیکار رہا، انہی شریعت باز اور آخرت ساز دانشوروں کی ایک بڑی تعداد آج منٹو کے متون کی بازیافت میں مشغول ہے۔ کمال حیرت ہے کہ فی زمانہ دائیں بازو کے مثالیت پرست اور عمر بھر مذہبیات کو سماجی عمل کی کلید قرار دینے والے "اسلامی ناقدین" بھی منٹو پرست ہونے کے دعوی دار ہیں۔ جس کا سبب اردو ادب کا امریکی سرمایہ دارانہ نظام کے سایے میں صارفی حیثیت اختیار کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک آدھ مثال سے وضاحت لازم ہے کہ بعد از تقسیم جماعت اسلامی سے وابستہ احباب جن میں بیشتر کا تعلق جامعات سے رہا۔ منٹو کو جنسیت زدہ قرار دینے کے علاوہ، اس کو اس کی تحریر کے جرم کی پاداش میں کورٹ کچہریوں میں گھسیٹتے پھرے جبکہ آج انہی کے پیروکار منٹو پرستی کے دعویٰ دار ہیں۔ اس حقیقت کے ادراک کی یوں بھی سعی کی جا سکتی ہے کہ عمر بھر منٹو اور اس کے فکشن کی جمالیات کے ناقد وزیر آغا، جنہوں نے رحمان مذنب ایسے کمزور کہانی کار کے سعادت حسن منٹو کے ساتھ تقابل بلکہ برابری کی خاطر "خوشبودار عورتیں" جیسی کمزور تصنیف کے پرچار میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی منٹو کی عوامی شہرت و مقبولیت اور پھر ریاستی اداروں کے توسل سے اس کے فن کی توصیف کے تفاعل میں پہلی قطار میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ جب مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے منٹو کے صد سالہ جشن پر "منٹو صدی: منتخب مضامین" نامی مدونہ کتاب چھاپی تو ان ہی "بڑے ناقدین" کے مضامین منٹو شناسی کے باب میں شامل کیے گئے، جو منٹو کو عام افسانہ نگار اور جنسیت زدہ قرار دیتے رہے۔ حتی کہ اس کتاب کے مرتب محترم روف پاریکھ ہیں۔ جن کا شمار پہلی صف کے قومیت پرستوں اور دائیں بازو کی فکری تنظیم کے روح رواں مصنفین میں ہوتا ہے۔ اور اس پر تس ان کا تخصیصی میدان بھی فکشن کی تفہیم و بازیافت کے برعکس لغت نویسی کا ہے، مگر مقتدرہ قومی زبان کے سرمایہ جاتی پراجیکٹ میں، اپنے عمر بھر کے دعویٰ اور میدان سے طویل چھلانگ لگا کر منٹو شناسی کے دعویدار بن جاتے ہیں۔

منٹو اردو افسانے کا وہ نام ہے جس کے تخلیقی متن پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ محض رسائل کے خصوصی نمبر دیکھیں تو ان کی تعداد درجن بھر سے زیادہ ہے۔ 1955ء میں منٹو پر چھ رسائل نے خصوصی نمبر شائع کیے۔ نقوش لاہور نے، افکار کراچی نے، شاعر ممبئی نے، گل خنداں لاہور نے، نقش کراچی اور پگڈنڈی امرتسر نے۔ اردو ادب کا یہ منفرد کہانی کار ہمیشہ انسان کی داخلی حساسیت کو مرکز بنا کر حقیقت کے کربناک سناٹے کو گونج میں بدلنے کے عمل میں مشغول رہا اور ریاکاری سے دور رہ کر عمر بھر ریاکاری کے خلاف لکھتا رہا، جس طرح منٹو مذہبی رعونت میں لپٹے چہروں کے "مذہبی عماموں" میں پھل جھڑیاں چھوڑ کر اپنی معصوم خوشی سے نہال ہوتا، اسی طرح، ان کے "فراڈ" پر خون کے آنسو روتا، وہی خفیہ مذہبی عمامہ بردار اور اعلانیہ منٹو شکن اردو کے صارفی دور میں منٹو شناس بن بیٹھے ہیں۔ مجھ ایسے کم فہم کو سمجھ نہیں آتی کہ وزیر آغا کی ان سطور کو منٹو فہمی کے کس باب میں رقم کیا جائے؟ "منٹو کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے ہاں دو طرح کے افسانے ملتے ہیں۔۔۔ ایک وہ جنہیں آپ اول درجے کی تخلیقات قرار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں اور اکثر لوگ اس سلسلے میں آپ کے ہم خیال ہوں، دوسرے وہ جنھیں آپ پہلی قرآت میں مسترد کر دیں اور لوگ اس معاملے میں بھی آپ سے متفق ہوں(5) جن لوگوں کے دونوں صورتوں میں متفق ہونے کا تذکرہ وزیر آغا کر رہے ہیں۔ وہ یقیناً انہی کے ہم خیال ہونگے کہ عمر بھر ان کی اپنے مکتب فکر سے مطابقت نہ رکھنے والے تخلیق کاروں سے نہ بن سکی۔ حتی کہ انہوں نے احمد ندیم قاسمی کے "فنون" کی ترقی پسندی کا مقابلہ نظری سطح پر کم جبکہ وزیر کوٹ کے باغات و فصلات سے آمدہ رقم سے سیاہ کردہ "اوراق" سے زیادہ کیا (اوراق کی خالص ادبی حیثیت موضوعِ بحث نہیں)۔ منٹو صدی میں شامل وزیر آغا کا مضمون اپنے عنوان کی رعایت سے منٹو کے افسانوں میں عورت کے کردار کا ساختیاتی مطالعہ ہے۔ مگر اب کیا کریں کہ شومئ قسمت اردو میں مارکس بنیاد جدیدیت کی ذمہ داری بھی بنیاد پرست ناقدین نے بزعم خود اٹھا رکھی ہے۔ تو یہ نیک طبع ماہرین فکر و فلسفہ جدیدیت اور اس سے منسلک جدلیات کو ماورائی حقیقتوں کے ادراک سے مسلمانیت سے ہمکنار کرنے پر مصر ہیں۔ منٹو کی خوش بختی کہ وزیر آغا منٹو کے دو افسانوں "نیا قانون" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کو موضوع اور تناظر کے باب میں وسعت انگیز تسلیم کرتے ہیں۔ وگرنہ وہ منٹو کو یک قلم مسترد بھی کر دیتے تو کوئی اُن کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ کہانی اور مصنف کے معاشرتی کردار پر ژاں پال سارتر کی رائے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ منٹو پر ہونے والے اعتراضات کس طرح بے معنی اور شخصی اختلاف کا نتیجہ ہیں۔ سارتر اپنے مضمون میں لکھتا ہے کہ "ادیب کو چاہیے کہ اپنے عہد کے لئے لکھے۔ عظیم ادیبوں نے یہی کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب خود کو اپنے عہد میں مقید کر لے۔ اپنے عہد کے لئے لکھنے کا مطلب عہد کی انفعالی طور پر عکاسی کرنا نہیں بلکہ اس کے برعکس اسے برقرار رکھنے یا بدل دینے کی شعوری کوشش ہے۔ یوں ادیب اپنے عہد سے

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.4 (2023)
(October- December)

آگے مستقبل کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔اپنے عہد کو بدل دینے کی کوشش ہماری جڑیں اپنے عہد میں اور مضبوط کر دیتی ہے "(6)وزیر آغا منٹو کی افسانہ نگاری کے ادبی تعین کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:۔"عصمت کی طرح منٹو بھی عورت کے باغی روپ میں دل چسپی رکھتا ہے اور اسی کو اپنے افسانے میں ابھارنے کا متمنی ہے (مزید تفصیل کے لیے دیکھیں منٹو صدی: منتخب مضامین) باغی اور حساس کے درمیان وزیر آغا کے نزدیک کوئی تفریق نہیں۔اس پر تس منٹو کو عصمت کی افسانہ طرازی کے مماثل قرار دینا تنقیدی ریاکاری کے علاوہ کچھ نہیں۔ منٹو کے افسانے کی عورت باغی نہیں بلکہ اپنے اندر موجود مشرقی نسائیت کی تکذیب پر رد عمل ظاہر کرتی ہے۔ساتھ ہی وہ پدر سری معاشرے میں اپنے وجود کے جواز سے آگاہ ہو جاتی ہے۔جب کھڑکی کھولنے کی آواز پر وہ آزار بند کھول دیتی ہے۔اِس افسانے کو بھی جماعت اسلامی نفسیات کے ناقدین نے محض انجام کی ایک واقعاتی دلالت کے ساتھ جوڑ کر دیکھا اور افسانے میں بکھرے بہت سے ثقافتی، زمینی اور حقیقی نشانات کو یکسر رد کیا ہے۔ وگرنہ اس افسانے کے آخری حصہ میں چار کردار بیٹی، والد، ڈاکٹر، مددگار پورے افسانے کی فکری ماہیت کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ کھڑکی کھولنے والے مددگار کے علاوہ تینوں کردار ہندوستانی ثقافت کے کئی اسرار کھولتے ہیں۔ایک طرف والد ہے جس کے لیے بیٹی کا آزار بند کھولنا/عزت بارے رائج مشرقی تصورات کی بیٹی کی زندگی کے عوض کوئی حیثیت نہیں اور اس کے لئے یہ پورا منظر کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ وہ خوشی سے نہال ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی بیٹی زندہ ہے۔اس خوشی کے سامنے دیگر تمام واقعات اس کے لیے غیر اہم ہو جاتے ہیں۔لڑکی کے آزار بند کھولتے ہی ڈاکٹر کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو جاتی ہے۔ جس سے ہند، پاکستان میں مرد کی ایک خاص نفسیات کا پتہ چلتا ہے۔ کہ سب مرد ہوس پرست اور جنسی مریض نہیں ہوتے بلکہ انسانیت اور اپنے پیشے سے مخلص وابستہ کردار بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ایک کردار لڑکی کا بطور مہاجر عورت کا ہے۔ جس کے حافظے سے تمام نشانات محو ہو گئے ہیں۔ جبکہ اس کا سگنی فائر محض اس کی جنسی صورت تک محدود ہو گیا ہے اور وہ اس سے جڑے تمام نشانات کو جنسی عمل کی دلالت سے ہی جوڑتا ہے۔

منٹو کے اس افسانے کو جو بھی شخص جنسی افسانہ کہے اسے خود فوری طور پر نفسیاتی معالج کی ضرورت ہے۔اپنے حقیقی معنوں میں یہ افسانہ مشرقی مرد کے منہ پر ایسا زور دار تمانچہ ہے۔ جس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔ منٹو کی تخلیقی بصیرت اور معاشرتی عمل میں حصہ داری کو جس طرح بلقیس عابد علی نے لکھا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اسی جملے سے لگایا جا سکتا ہے۔"منٹو زندہ تھا تو عوام کو امید تھی کہ جب بھی کوئی ناانصافی ہو گی۔ منٹو کے نوٹس میں آجائے گا اور پھر وہ سماج کو، عوام کو، حکومت کو مجبور کرے گا کہ اس حقیقت کے گھناؤنے گوشے کو کم از کم جھانک کر دیکھ لے "(7)ڈاکٹر انوار احمد کے تنقیدی متن میں منٹو کو بطور انسان اور حساس تخلیق کار کے پیش کیا گیا ہے۔ ترقی پسند افکار سے شدید ذہنی اور دلی لگاؤ رکھنے کے باوجود ڈاکٹر انوار احمد کے ہاں تنقیدی رمز اپنے اصل جوہر کے ساتھ ملتی ہے۔ جماعت اسلامی کی طرز پر کسی ایک طرف جھکی ہوئی نہیں۔انوار صاحب نے منٹو کے لگ بھگ تمام نمائندہ فکشن کا قرب متن مطالعاتی ڈسکورس کی بنیاد پر تجزیہ کیا ہے۔اس ڈسکورس میں ان کے نتائج کئی طرح کے حقائق سے بھرپور ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا منٹو کے فکر و فن پر ڈاکٹر سلیم اختر، ممتاز شیریں، چندر ودھان، ڈاکٹر سید عامر سہیل کے علاوہ ڈاکٹر انوار احمد صاحب سے زیادہ واضح اور راست تجزیہ کسی ناقد نے نہیں کیا اور یقیناً اس کی وجہ تخلیق کار اور ناقد کے درمیان فکری ہم آہنگی کا وجود ہے۔ منٹو پر اگر ڈاکٹر وزیر آغا لکھیں گے، حمید شاہد صاحب لکھیں گے، نجیبہ عارف لکھیں گی، عزیز ابن الحسن صاحب لکھیں گے تو ان کے داخلی محرکات منٹو کی تحریر سے انسیت کا سبب بن ہی نہیں سکتے۔ان کی فکری اساس قدامت پرستی یا مذہب کی بنیاد پر استوار ہے۔ جبکہ منٹو کسی بھی مذہبی بنیاد ثقافتی اکائی یا مرکب کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ منٹو کا مسئلہ مذہب نہیں بلکہ انسان ہے۔وہ انسان جو اس کے اطراف ہزاروں برس پر محیط اجتماعی ثقافت کو روندتا چلا جاتا ہے۔ جو اخلاقیات کے اصولوں کو پامال کرتے ہوئے اپنی مٹھی بھر داڑھی کی پرواہ بھی نہیں کرتا۔یہی وجہ ہے کہ سعادت حسن منٹو کے متن کی تفہیم کا بار اشفاق سلیم مرزا اٹھا سکتے ہیں، روش ندیم اٹھا سکتے ہیں اور اس متن میں تیرتے تیروں کے وار سہہ کر نتائج کی کشید ڈاکٹر سید عامر سہیل کر سکتے ہیں۔

انوار صاحب کی کچھ سطور دیکھیں:"منٹو فن کار کے آزادی اظہار کی ہر رکاوٹ کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔وہ غلامی کی ہر صورت سے نفرت کرتا تھا۔۔۔۔۔منٹو جنسی پرورژن کو ناپسند کرتا تھا اسی لئے جب وہ اس موضوع پر لکھتا ہے تو اس کی فضاء میں کراہت کا احساس غالب آجاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔عام طور پر ڈرامائیت، چونکانے کی آرزو اور غیر متوقع انجام منٹو کے سٹائل کے بنیادی اوصاف قرار دئے جاتے ہیں۔ جو موپساں اور او ہنری کے اثرات کا کرشمہ بتائے جاتے ہیں۔تاہم یہ واقعہ ہے کہ منٹو کا بنیادی وصف معاصر عہد کی منافقت کا پردہ چاک کرنا اور انسانیت کی تکریم ہے۔اس کے جتنا موثر استعمال منٹو نے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو(8) کسی بھی فکشن نگار کے حوالے سے اس امر کی داخلی شہادت تلاش کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک متن کو کیا فکری پس منظر یا خاص معنی دینا چاہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ معنی کا یہ تناظر متن پارے سے براہ راست اخذ کیے جانے والے معنی سے متوازی ہی کیوں نہ ہو۔ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی متن میں کچھ الفاظ، تراکیب، علامات یا واقعہ مصنف کی باطنی نسبت کو ظاہر کرنے میں ناکام رہا ہو لیکن ایک فن پارہ بحثیت مجموعی اس خاص مفہوم کی پیشکش میں کامیاب ہو سکتا ہے منٹو کے معاملے میں صورت حال مزید پیچیدہ ہے کہ منٹو کے متن کا جذباتی پیرایہ خود قاری اور ناقد کے جذباتی

میلان پر فوقیت لے جاتا ہے۔ جس سے دو اطراف کے تعصب کو ہوا ملتی ہے۔اس صورت میں ناقد اپنے فکری، شعوری، لاشعوری تعصب یا پسند ناپسند پر منٹو کے متن کی تفہیم کرتا ہے اور اس تفہیمی ڈسکورس میں جذباتی سطح پر منٹو سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف عمل ہوتا ہے۔ جس کے باعث منٹو کے متن پر پہلے خود منٹو کا شخصی تاثر اور پھر ناقد کی اپنی جذباتی وابستگی غالب آجاتی ہے۔ حتی کہ وارث علوی نے اپنے مضمون مشمولہ منٹو صدی: منتخب مضامین میں یہاں تک کہہ دیا کہ منٹو خالص کہانی کار نہیں ہے اور اسے اپنی تحریر کو تراش خراش سے خالص کہانی بنانا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سعادت حسن منٹو کے افسانے میں sensibility کا نہ ہونا ہے۔وارث علوی کے مطابق منٹو کو اپنی ذات میں نہیں گرد و پیش کے لوگوں میں دلچسپی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیں، منٹو صد: منتخب مضامین) وارث علوی کے اس بیان سے کیا نتیجہ اخذ کیا جائے کہ مصنف محض اپنی شخصیت کا گرویدہ ہوتا ہے، اسے اپنی زندگی اور اپنے معاملات کے علاوہ کسی شئے سے سروکار نہیں ہوتا اور اس انفرادی شخصیت پرستی کے دوران وہ اپنے گرد و پیش سے لاتعلقی اختیار کر لیتا ہے، یعنی اگر کسی تخلیق کار کی ازدواجی زندگی کچھ کجیوں سے معمور ہے تو وہ عمر بھر یا کم از کم اس واقعہ کے دوران اسی کو لکھتا رہے گا، اگر کوئی تخلیق کار انعامی بانڈ جیت جاتا ہے تو اس کی تخلیق میں فرحت وانبساط کے لافانی عناصر گھر کر جائیں گے؟ بہتر تھا کہ وارث علوی منٹو کے معاصرین سے ہی کچھ مثالیں دیتے اور دعوی کرتے کہ پریم چند کا کفن اس کا ذاتی تجربہ ہے، بیدی کا باپ واقعی کہانی کار کی طرف سے باپ کی فروخت کا اشتہار تھا؟ غلام عباس کا اوور کوٹ اس نے حقیقی تجربہ کرنے کے بعد، بعد از مرگ حیات پا کر لکھا یا اشفاق احمد کا گڈریا خود اشفاق احمد ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر اوپری سطور میں وضاحت کی گئی ہے کہ قاری یا ناقد متن سے من چاہے معنی کی ساخت میں خود متن کے تخلیقی دوائر سے کٹ سکتا ہے اور ایسا منٹو کی تفہیم کے باب میں بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ تخلیقی متن میں حقیقی حیات کے جوہر بارے لوکاچ کے نکتہ ء نظر کو اصغر علی انجینئر یوں بیان کرتے ہیں کہ "یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ ہمارے دور کے نمائندہ حقیقت پسندوں کو مقبولیت حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے انقلاب میں گہرائی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں تباہ کاری سے نفرت کرتے ہیں۔ جو انہیں اپنے گرد و پیش نظر آتی ہے اور کسی ہیت پرست کی طرح اپنی تحریروں کو محض نعروں سے آراستہ کرنے کا کام نہیں کرتے "(9) یہی موضوع اور حالت کی حقیقی حالت سے گہری وابستگی اور ان کی پیشکش میں کہانی کار کا حقیقی نکتہ ء نظر اس کے متن کو قابل توجہ اور اپنے سے بعد آنے والے عہد سے متعلق بھی بنا دیتا ہے۔ منٹو نے محض کسی کردار کے لیے نہیں لکھا نہ وہ سوگندھی یا ہتک کی عورتوں سے خاص ہمدردی رکھتا ہے بلکہ اسے اُس روش اور اُس اخلاقی نظام پر اعتراض ہے جسے اِن سب کے گرد بُن دیا گیا ہے اور جس کے جال میں وہ بری طرح پھنس کر رہ گئی ہیں۔

محمد حمید شاہد کی ان سطور کے تجزیاتی مطالعہ پر مقالہ کو اختتام دوں گا۔ "بے شک منہ بھر کر طعنے دے لیجیے کہ منٹو فحش نگار تھا، سلیم احمد مرحوم نے جب منٹو کی فحش نگاری کا دفاع کیا تھا تو میں نے بھی تنک مایہ لفظوں کے طومار سے تنگا تنگ کیا تھا۔ یہ بھی مان لیتے ہیں کہ وہ جنس کو لذت بنا لیا کرتا تھا۔اسے بھی تسلیم کر لیجیے کہ وہ عشق کو جنس کی تلچھٹ سمجھتا تھا۔۔۔اور یہ تو عین درست ہے کہ اس نے خود کہا تھا، جو زندگی پرہیز میں گذر جائے قید ہے۔اس نے افسانہ "عشق حقیقی" میں عشق کو جنس کے تابع کر دیا تو درست نہیں کیا۔اس نے "ٹھنڈا گوشت" میں لذت بھر دی، یہ بھی درست نہیں تھا۔اس نے "برمی لڑکی" میں جنس اور عورت کے امتزاج سے نسائی فطرت کے تنوع کو پورٹریٹ کیا تو آپ کا اعتراض بجا ہو سکتا ہے اور منٹو کا رویہ سراسر غلط ہی ہو گا۔ اس نے "پری" میں جب یہ ثابت کیا کہ جنس عورت کو بے بس کر دیتی ہے تو یہ خلافِ واقعہ کہا جا سکتا ہے اور مان لیتے ہیں کہ ادب نام ہی ناگوار کو گوارا بنا لینے کا ہے۔۔۔۔ مگر جب "ہتک" کی طوائف کے بستر سے عورت کا المیہ سر اٹھا لیتا ہے اور جب "کھول دو" میں بوڑھا باپ اپنی بیٹی میں زندگی کی علامات پا کر خوشی سے چیخنے لگتا ہے تو کیا اس کا اعتراف بھی نہیں ہونا چاہیے کہ منٹو فن کی بلندیوں کو چھو رہا ہوتا ہے"(10)۔اس صفحہ بھر وضاحتی تجزیہ میں عجیب معذرت خواہانہ التجا ہے جو منٹو کے فکر و فن کی رد اور تائید پر مشتمل ہے۔ نہ تو منٹو کے فحش نگار ہونے پر کوئی مثال دی گئی ہے اور نہ ہی جنسی لذت کے بیان میں جنسیاتی پیرا گراف یا افسانوی عنوان رقم کیے گئے ہیں۔ہاں وزیر آغا کی طرح آخر کار منٹو کے دو افسانوں کی تعبیر سے اس کے فن کا اقرار کیا گیا ہے کیونکہ رائٹ کا نقاد منٹو کی بڑائی کا کھلے دل سے معترف ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ اس کے مرکزی فکری جوہر کے خلاف ہے۔ عورت کے علاوہ منٹو کا موضوع مرد کی نفسیات میں پنہاں جذبہ ء عورت، مرد اور عورت کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات، ہندوستانی سیاست میں جاری نفاق و مادیت پرستی، انگریز راج میں احساس غلامی سمیت کتنے لاتعداد انفرادی، اجتماعی، معاشرتی موضوعات ہیں۔ جن پر منٹو کے قلم کی روانی میں لمحہ بھر کو توقف نہیں آتا۔ ہندوستانی فلمی دنیا کی چکا چوند سے، اطراف پھیلے مصنفوں کی نفسیاتی گتھیوں کو جوں منٹو نے سمجھا اور بیان کیا ہے۔ اردو کی حد تک اپنی مثال آپ ہے۔ مگر منٹو شناسی کے میدان میں شہ سواروں نے منٹو کی معاشرتی تفہیم کو تجریدی جبکہ جنسی ساختی نشانات کو تجسیمی قدر بنا کر پیش کیا ہے۔ اگر کوئی بھی ناقد خواہ اس کی وابستگی شعری متون کی بازیافت سے ہو یا نثری متون کے معنی و مفہوم کے تعین کے ساتھ، اس سماجی تفاعل سے آگاہ رہنا چاہیے کہ معاشرہ تخلیق کار کے لیے تجریدی نہیں بلکہ تجسیمی حالت میں مجموعہ حقائق ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ تجرباتی، احساساتی، مشاہداتی، جذباتی جڑت کے نتائج تخلیق کار کے صیغہ ءاظہار سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ منٹو اپنے افسانوی متون

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.4 (2023)
(October- December)

کی پیشکش سے اپنے معاشرے میں شخصی اقدار واطوار کی انفرادی،اجتماعی بالیدگی اور ارتقاء کے حصول کے لیے افراد کے متفرق باہمی تعاملات کو فکشن کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ زیادہ مہذب معاشروں میں انسانی نفسیات اور اس کی اقداری صورت حال کو سمجھنے کے لیے ادب و فن کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اردو میں چونکہ ابھی تک کوئی ادبی تاریخ نہیں لکھی گئی بلکہ سیاسی،شاہی معرکوں کے زیر اثر بنتے افراد اور ان کے تخلیقی متون کی تشریح کو ادبی تاریخ بنا کر پیش کیا جارہا ہے،تو جہاں معاشرتی،سماجی اقدار کی زمینی کیفیت منظر عام پر لانے کا کوئی ادبی نظام وضع نہیں ہو سکا۔اسی بے پر کی ادب تفہیمی صورت سے منٹو کے فکشن کو بھی نقصان پہنچایا گیا ہے۔منٹو نے اپنے فکشن کے توسل سے عورت،مرد،عاشق،طوائف، مسلمان،ہندوستانی،ہم جنس پرست،انقلابی سمیت فعال زندگی کے بے شمار کرداروں کی زندگی کو متحرک تمثالوں کی صورت تخلیق کیا ہے۔

عورت منٹو کے ہاں ایک داخلی کرب میں مبتلا طوائف ہے جس کا مشغلہ جسم فروشی ضروری نہیں بلکہ وہ اپنے شوہر کی چار دیواری میں بھی اسی طرح کی بے کسی کا شکار ہے۔عورت کا وجود سماج کے لیے اضافی ضرورتی قدر جبکہ منٹو کے لیے بنیادی قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔جس کے گاہک اور دیگر اطراف موجود لوگ،اسے ایک برائے فروخت پراگندہ جسم،پراگندہ روح کے تسلیم کرتے ہیں اور اس کے داخلی احساس اور انسانی نفسیات پر اس کے جسمانی لوتھڑوں،اس جسم کی کسائی اور شہوت انگیزی کی خصوصیات کو فوقیت دیتے ہیں۔منٹو کی عورت احساس گزیدہ ہے،جس کا جسم مجبوری کی گٹھڑی بن کر اس کے فکر واحساس کے کندھوں پر لدا ہوا ہے۔منٹو کے لیے طوائف سمیت کسی بھی عورت کا وجود،اس کی چھاتی،کندھے،ہاتھ،پاوں،ٹاں مگیں حتی کہ جنسی تجربات بارے موادنہ ہونے کے برابر ہے اور جو ہے اس کا پس منظر بھی کراہت آمیز ہے۔جنسی رغبت یا خواہش کی بیداری کا عامل نہیں۔دیگر معاشرے بالا خانے پر بیٹھی عورت سے لے کر گلیوں بازاروں میں موجود عورتوں تک کو انہیں اصولوں کی بنیاد پر دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں۔اسی غالب تصور کی بنیاد پر منٹو شناسی کی نہادر کھی گئی جو آج ایک بلند و بالا عمارت ہے۔ایسی عمارت جس کے ہوا بند در و دیوار میں خود منٹو کی سانس گھٹنے کا احتمال حتمی ہے کیونکہ منٹو جنس کا نہیں انسانیت اور اس کے داخلی کرب کا پیش کار کہانی کار ہے۔جس کی تمام عمر اپنی غیر معمولی بصارت و بصیرت کے بل پر منتشر انسانی ہجوم کو انسانی معاشرے میں بدلنے کی تگ و دو میں مصروف رہی۔

حواشی و حوالہ جات

1. نیاز فتح پوری،علامہ،عورت اور فنون لطیفہ،فکشن ہاؤس،لاہور،2017،ص90،89
2. وزیر آغا،ڈاکٹر،"منٹو کے افسانوی میں عورت"مشمولہ"سعادت حسن منٹو(منٹو صدی:منتخب مضامین)،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،2011،ص301
3. انوار احمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ،مثال پبلشرز،فیصل آباد،2010،ص240
4. ابو سعید قریشی،سعادت حسن منٹو(منٹو صدی:منتخب مضامین)ص153
5. وزیر آغا،ڈاکٹر،منٹو کے افسانوں میں عورت،ص301
6. ژاں پال سارتر،مضمون"اپنے عہد کے لئے لکھنا"مشمولہ،ادب اور ادیب،نگارشات،1988،ص177
7. بلقیس عابد علی،"منٹو مر گیا"،مشمولہ"گل خنداں"،مدیر:عبدالروف،لاہور،شمارہ6،جلد6،1955،ص65
8. انوار احمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ،مثال پبلشرز،فیصل آباد،2010،ص267،265،262
9. اصغر علی،انجینئر،لوکاچ اور مارکسی تنقید،فکشن ہاوس،لاہور،2018ص64
10. محمد حمید شاہد،"سعادت حسن منٹو___ہمارا ہم عصر"،مشمولہ،منٹو صدی:منتخب مضامین،)،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،2011،ص604